ڈاکٹر عائشہ سعید
صدر شعبۂ اردو، جناح یونیورسٹی
برائے خواتین، کراچی

دساتیرِ پاکستان اور سرکاری و تعلیمی سطح پر نفاذِ اردو کا منظرنامہ

The civilized nations formulate various political institution. These institutions helpmaintain the social life while the absence of these institutions leads to a failure of balance in social life. Constitutions reflect the national aspiration. With the help of a constitution, we can easily observe and study the civilization and culture of a nation. Pakistan's firstconstitution promulgated in1956 determined English as the medium of instruction.Thus, from the very beginning Urdu as an official language was put on the back bu8rner. This has resulted in the unemployment of Urdu as a language at various stages in spite of the deliberated efforts.In this paper I have addressed the issue of implementation of Urdu as official language and as a medium of instruction.

دستور قوم کی تمناؤں کا عکاس، سوچ وفکر کا محور اور عوام الناس کے حقوق اور آزادیٔ رائے کے تحفظ کا ضامن ہوتا ہے۔ ہر ملک کا دستور اس کے انتظامی ڈھانچے، عدالتی نظام، سیاسی اداروں کے استحکام کی وضاحت کرتا ہے۔ یہی دستور قوم کے مستقبل کا فیصلہ ساز بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قوموں کی زندگی میں دستور سازی اہم ترین اور مشکل ترین فریضے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دستور سازی عام حالات میں بھی پیچیدہ اور صبر آزما کام ہوتا ہے لیکن پاکستان نے دستور کے تعاقب میں تقریباً چھبیس سال صرف کر دیے جو شاید عالمی ریکارڈ ہے۔[1]

پاکستان کے دساتیر کا سلسلہ وار جائزہ تقاضا کرتا ہے کہ برصغیر کے ابتدائی سیاسی و تہذیبی دھندلکوں میں جھانک لیا جائے۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں مسلم ریاست کا ٹھوس و مدلل تصور یقیناً ڈاکٹر محمد علامہ اقبال نے پیش کیا۔ اپنے خطبۂ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء میں ان الفاظ میں انھوں نے اس نظریے کی وضاحت و تشریح پیش کی:

> ''یہ ناقابلِ انکار حیثیت ہے کہ اسلام بطور ایک اخلاقی نصب العین اور سیاسی نظام مسلمانانِ ہند کی تاریخ کا اہم ترین جزو ترکیبی رہا ہے۔ اس اصطلاح سے میری مراد ایک ایسا معاشرتی ڈھانچہ ہے جس کا نظم و ضبط ایک مخصوص اخلاقی نصب العین، تعین اور نظامِ قانون کے تحت عمل میں آتا ہے۔ اسلام ہی نے وہ بنیادی جذبات اور وفاکیشی فراہم کی

جو منتشر انسانوں اور گروہوں کو بتدریج متحد کرتی ہے اور انھیں ایک اپنا اخلاقی شعور رکھنے والی تمیز و معین قوم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ دنیا میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں اسلام ایک بہترین مردم ساز قوت کی حیثیت سے جلوہ گر ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلامی معاشرہ تقریباً پوری طرح ایک مخصوص اخلاقی نصب العین کی ثقافت سے بنا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلم معاشرہ اپنی نمایاں ہم آہنگی اور اندرونی اتحاد کی جس صورت میں ارتقا پذیر ہوا ہے وہ ان قوانین اور اداروں کے باعث ہے جو اسلامی ثقافت سے وابستہ ہیں۔''[۲]

اقبال کے اس تصور کو چودھری رحمت علی نے ''پاکستان'' کا نام دیا اور قائداعظم محمد علی جناح کی زیرِ قیادت مسلم لیگ نے سات سال کی مختصر مدت میں اس تصور کو حقیقت بنا دیا اور پاکستان کی اسلامی مملکت کے قیام کا آئین برطانوی پارلیمنٹ میں Indian Independent Act کے تحت ۱۷ر جولائی ۱۹۴۷ء کو پاس ہوا۔[۳]

مملکتِ پاکستان کے قیام کے بعد انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو عارضی بنیادوں پر آئینی اساس قرار دیتے ہوئے نئے دستور کی تکمیل تک ترجیحات پر عمل پیرا ہونے کے لیے اہم شخصیات کو فرائض سونپے گئے۔ اس کے ساتھ ہی آئین ساز اسمبلی کی تشکیل بھی عمل میں آ گئی۔ مارچ ۱۹۴۹ء میں دستور سازی کے لیے آئین ساز اسمبلی نے انتظامی بنیادوں پر کام شروع کیا یہاں یہ امر قدرے دلچسپی کا مظہر ہے کہ آئین سازی کی ابتدا قراردادِ مقاصد کی منظوری سے کی گئی اور اغراض و مقاصد کی مختصراً وضاحت جس میں جمہوری اصولوں، آزادی و مساوات اور معاشرتی اقدار کے اسلامی اصولوں کی یقین دہانی کے ساتھ ہی بنیادی حقوق، عدلیہ، وفاق و صوبائی اختیارات کی حدود کا تعین عمل میں آیا۔[۴]

۳۰ر اپریل ۱۹۵۴ء کو اسمبلی میں زبان کے مسئلے کا فیصلہ کیا گیا اور اردو، بنگالی دونوں ملک کی سرکاری زبانیں قرار دی گئیں (یہ امر مدنظر رہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی تک اس آئین کی زبان سے متعلق یہ شق قائم رہتی ہے) اور آئین کے نفاذ کے بیس سال بعد تک انگریزی بطور سرکاری زبان باقی رکھی گئی۔

مشرقی پاکستان کے انتخابات ۱۹۵۴ء میں مسلم لیگ کی کامیابی کا عدم تناسب و عدم اعتماد اس آئین ساز اسمبلی کی تنسیخ کا باعث بنتا ہے جو سیاسی حلقوں میں اضطراب پھیلا دیتا ہے اور ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ملک میں ہنگامی حالات کے اعلان کے ساتھ اسمبلی توڑ دی جاتی ہے وحدت مغربی پاکستان کا بل منظور کر کے مغربی پاکستان کو ایک صوبہ بنایا جاتا ہے اور آئین سازی پر نظرثانی کر کے آئین کا بل ۹ر جنوری ۱۹۵۹ء کو دستور ساز اسمبلی میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ جو ۲۹ر فروری ۱۹۵۶ء کو مسودہ دستور کی شکل میں پاس ہو کر ۲ر مارچ ۱۹۵۶ء کو گورنر جنرل کی منظوری میں پاس ہو جاتا ہے۔ اردو زبان کے سرکاری زبان ہونے کی بابت اس پہلے باقاعدہ دستور کی شق ۲۱۴ کے مطابق:

سرکاری زبانیں:

۱۔ اردو اور بنگالی پاکستان کی سرکاری زبانیں ہوں گی۔ البتہ یومِ دستور سے بیس سال تک انگریزی زبان ان تمام اغراض کے لیے استعمال ہوتی رہے گی جن کے لیے وہ یوم دستور سے فوری قبل مستعمل تھی لیکن پارلیمنٹ کو اختیار حاصل ہوگا کہ مذکورہ بیس سالہ مدت کے اختتام پر ایک ایکٹ کے ذریعے ایسے اغراض کے لیے جن کی صراحت ایکٹ میں موجود ہو، انگریزی کے استعمال کا اہتمام کرے۔

۲۔ یوم دستور سے دس سال بعد صدرِ مملکت اس غرض کے لیے ایک کمیشن مقرر کرے گا کہ وہ انگریزی کی جگہ لینے سے متعلق سفارشات پیش کرے۔

۳۔ اس دفع میں کوئی امر کسی صوبائی حکومت کے انگریزی کے بجائے کوئی دوسری سرکاری زبان مذکورہ بیس سالہ مدت کے اختتام سے پہلے اختیار کر لینے میں مانع نہیں آئے گا۔[۵]

اس دستور کے تینوں مندرجات میں ''اردو زبان کی حیثیت ثانوی نظر آتی ہے اس وقت کے تقاضوں کے مطابق ''بنگلہ'' اور ''انگریزی'' کی عمل داری اس اعتبار سے مستحکم تھی کہ پاکستان نیا نیا آزاد ہوا تھا۔ اس لیے انگریزی زبان کی حیثیت اس دستور میں مستحکم اور مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت کے لسانی بنیادوں پر عدم استحکام کے خطرے کے پیشِ نظر ''بنگلہ'' زبان بھی مستحکم تھی۔ گویا اردو زبان جو صدیوں سے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی اسے آئندہ بھی اسی جنگ کے لیے تیار رہنا تھا۔ کیونکہ وہ اب بھی عدم تعاون کا شکار تھی فرق صرف یہ تھا کہ اب وہ اپنوں کے ہاتھوں عدم تعاون کا شکار ہوگئی۔ افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان کا پہلا دستور انگریزی زبان میں پیش کیا گیا۔ جس کی وجہ مترجم ''دستورِ پاکستان'' ۱۹۵۶ء شیخ عطا اللہ پرنسپل اسلامیہ کالج چنیوٹ نے اپنی کتاب کے دیباچے میں کچھ ان الفاظ میں پیش کی:

> ''انگریزی زبان کی عالمگیری، اس کی علمی منزلت اور بین الاقوامی اہمیت سے کسے مجالِ انکار ہے۔ پاکستان کا دستور بعض دوسرے ممالک کے دساتیر کی طرح ضرورتاً اور مصلحتاً انگریزی ہی میں مرتب ہوا لیکن زندہ قوموں کو بین الاقوامی مصلحتیں اور ملکی ضرورتیں ساتھ ساتھ ملحوظ رکھنی اور انجام دینی پڑتی ہیں۔ اردو اور بنگالی ہی ہماری ملکی زبانیں تسلیم کی گئی ہیں اور دستور میں ان کی ترویج اور اشاعت کا اہتمام ہماری قومی ذمے داری قرار پاتا ہے۔ صوبوں کو اجازت دی گئی ہے کہ جب چاہیں، انگریزی چھوڑ دیں اور اپنی اپنی ملکی زبان میں ہر قسم کا کاروبار انجام دینا شروع کر دیں۔''[۶]

گویا ضرورتاً اور مصلحتاً اس مملکتِ خداداد کا پہلا اہم ترین دستور، جس پر اس اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مستقبل کی بنیاد رکھی گئی تھی، انگریزی میں پیش کیا گیا جس کے ہمارے تعلیمی و سیاسی منظرنامے پر اثرات آج تک مرتسم ہیں اور یہ اجازت نامہ کہ ''جب چاہیں'' انگریزی چھوڑ دیں اور اپنی ملکی زبان میں ہر قسم کا کاروبار انجام دینا شروع کر دیں محض دستور کا حصہ اور ہماری زبان کی

شناخت کا المیہ ہے، جمیل جالبی کہتے ہیں:

''اردو کے بارے میں گزشتہ ۳۳ سال سے یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ ہر حکومت اسے آئین میں جگہ دے کر ایک کمیشن بنا دیتی ہے جس میں آٹھ دس سال آگے کی تاریخ ہوتی ہے اور اس ادارے یا کمیشن کے سپرد یہ کام کیا جاتا ہے کہ وہ اس عرصے میں ایسے کام کرے کہ اردو کو قومی و دفتری سطح پر اختیار کیا جا سکے، یہ ادارہ کیا کام کرتا ہے، کیسے کرتا ہے یہ تو اربابِ حل و عقد کو معلوم ہوگا لیکن ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ دس سال بعد وہ تاریخ آتی ہے اور پھر گزر جاتی ہے اور کچھ عرصے بعد ایک نیا ادارہ وجود میں آ جاتا ہے جس کے سپرد اسی قسم کے مقاصد کر کے فراغت حاصل کر لی جاتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ عمل عمداً کیا جاتا ہے یا محض بھولپن سے کیا جاتا ہے مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ کیا جاتا ہے اور اب تک اس کا وہی نتیجہ نکلا ہے جو نکلنا چاہیے تھا یعنی ڈھاک کے تین پات۔''[۷]

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے ملک کی قومی زبان اور ذریعہ تعلیم کے حوالے سے اپنے احکامات میں کبھی کسی بھی قسم کا ابہام نہیں رکھا تھا جبکہ اس وقت سے اب تک ہر حکمران اس معاملے میں لیت و لعل سے کام لے رہا ہے جس کی وجہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تعلیمی کانفرنس میں تیار کردہ پالیسی کے مطابق آئین میں موجود اردو زبان کی قومی زبان کے تحت منظوری کو ترمیم کے ساتھ پاکستان کی مشترکہ زبان قرار دیا گیا اور مدارس میں اس کی تدریس لازمی قرار دی گئی جبکہ دیگر زبانوں کو اختیاری و عملی سطح پر اختیار کرنے کی منظوری دی گئی۔ طاہر محمد خان (سابق وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات) لکھتے ہیں:

''پاکستانی زبانوں کی ترقی میں ہمیں زیادہ فصیح ادب ملے گا کیونکہ ہم جس قدر کھل کر مادری زبانوں میں بیان کر سکتے ہیں اس قدر بہتر اظہار کسی اکتسابی زبان میں نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کو اردو لکھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ لیکن سندھی، بلوچی اور پشتو کے ادیبوں اور صحافیوں کو ایسی آزادی میسر نہیں ہے اور نہ ہی ان زبانوں کا مزاج اردو سے ہم آہنگ ہے، نہ صرف زبانوں میں اختلاط بڑھنا چاہیے بلکہ لوگوں میں بھی زیادہ سے زیادہ انٹریکشن ہونا چاہیے۔ زبانوں کا اختلاط اس وقت ممکن ہے جب تمام مادری زبانوں کے معیاری ادب کو اردو میں منتقل کیا جاتا ہے تاکہ لکھنے والے بھی (Main Stream) منظر عام پر نظر آئیں۔ اگرچہ ہمارے پاس سرکاری اکیڈمیاں ہر جگہ موجود ہیں لیکن اب تک وہ ایسا نہیں کر سکے کیونکہ ان کی گرانٹ تو ان کی تنخواہوں اور دوروں پر خرچ ہو جاتی ہے۔ اگر ہم سوچیں تو موجودہ وسائل میں بھی اس نوع کے کام لیے جا سکتے ہیں۔''[۸]

طاہر محمد خان کے ان الفاظ کا لبِ لباب بھی یقیناً وہی ہے جو نقطۂ نظر قائداعظم کے خیالات سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ہم اپنی قومی زبان اردو کو ذریعۂ تعلیم عام بول چال کی زبان، دیگر زبانوں کے اختلاط کے ذریعے ہی قابل شناخت بنا سکتے ہیں۔ محض ملک کے آئین اور دستور میں زبان کا سرکاری سطح پر قیام بغیر عملدرآمد کے بے سود ہے۔

پاکستان کا دوسرا دستور:

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان (صدر پاکستان) نے جسٹس شہاب الدین کی سربراہی میں ایک آئینی کمیشن قائم کیا جس کا بنیادی مقصد سروے کے ذریعے ملک کے ہر صوبے سے آئینی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے خیالات معلوم کرنے اور مشورے و تجاویز اکٹھی کرنا تھا تاکہ پاکستان کے دوسرے آئین کے لیے زمین ہموار کی جاسکے۔ اس کمیشن نے ۶ مئی ۱۹۶۱ء کو ایک رپورٹ پیش کی جس کے نتائج حوصلہ افزا نہیں تھے وجہ ملک میں مخلص قیادت کا فقدان تھا۔ صدرِ پاکستان نے ۱۹۶۲ء کے پہلے ماہ میں اس کمیٹی کی سفارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۹۶۲ء کے آئین کی منظوری دے دی یہ آئین ۸ جون ۱۹۶۲ء کو نافذ کیا گیا۔ جن کے بعض بنیادی شعبے قابلِ منظوری تھے اور بعض پر نظر ثانی کی گنجائش تھی۔ پاکستان کی قومی زبان کے مطابق اس آئین کی رو سے:

شق نمبر ۲۸ کے مطابق:

''اردو اور بنگالی ملک کی قومی زبانیں ہوں گی۔ انگریزی زبان کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا رہے گا۔''[۹]

پاکستان کا تیسرا دستور:

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا تیسرا اور اب تک نافذ العمل آئین مجریہ ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو اسمبلی سے منظور ہوا اور ۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء میں صدر پاکستان نے اس کی منظوری دی:

شق نمبر ۲۵۱ کے مطابق:

۱۔ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی اور اسے دفتری اور دیگر معاملات کے لیے آئین کے نفاذ سے پندرہ سال کے عرصے میں رائج کر دیا جائے گا۔

۲۔ شق نمبر کے مطابق انگریزی کو دفتری امور کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ جب تک کہ اس کی جگہ اردو کے استعمال کے انتظامات مکمل نہیں ہو جاتے۔

۳۔ قومی زبان کے درجے کے تعصب کے بغیر کوئی صوبائی اسمبلی قانون کے ذریعہ تعلیم اور صوبائی زبان کی ترقی اور استعمال بمعہ قومی زبان کے انتظامات کر سکتی ہے۔

پاکستان کے دستور اور قومی زبان کے مسئلے کے حوالے سے ڈاکٹر صفدر محمود کے درج ذیل الفاظ اہمیت کے حامل ہیں۔

''پاکستان میں قومی زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا نازک رہا ہے اور اس کے سبب صوبائی تعصّبات کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی رہی ہے۔ پاکستان کے اکثر حلقوں کا یہ خیال تھا کہ عوام میں اجتماعی سوچ، قومی ذہن اور یکجہتی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے قومی زبان کا

ایک ہونا ضروری ہے۔''[۱۰]

وہ اس ضمن میں قائداعظم کی ڈھاکہ والی تقریر کا بھی حوالہ دیتے ہیں جس میں بابائے قوم نے کہا تھا کہ ''پاکستان کی قومی زبان بہرحال ایک ہوگی اور وہ اردو ہے البتہ اگر صوبائی حکومتیں اپنی سہولت کے لیے چاہیں تو کسی اور زبان کو بھی اختیار کرسکتی ہیں۔

۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دساتیر میں ''اردو زبان'' سے متعلق جن آئینی شقوں کو پیش کیا گیا ان کے اختصاری جائزے کے بعد ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۷ء میں پیش کیے گئے ترمیمی دستور کے دو اہم نکات درج ذیل ہیں:

- جنرل ضیاالحق نے یکم دسمبر ۱۹۸۴ء کی تقریر میں صدر اور وزیراعظم کو اختیارات میں توازن پیدا کرنے اور اسلام کو مذکورہ آئین میں مناسب مقام دینے کے لیے ترامیم کا اعلان کیا لیکن ''زبان'' کے مسئلے پر کسی ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔
- پاکستان کے ترمیم شدہ دستور ۵/مارچ ۱۹۸۷ء کی شق نمبر ۲۵۱ کے مطابق قومی زبان سے متعلق وہی تین نکات شامل رہے جو ۱۹۷۳ء کے آئین میں شامل تھے اور اس سے متعلق کسی نئی تجویز کو پیش نہیں کیا گیا۔[۱۱]

نفاذِ اردو کے تعلیمی سطح پر اقدامات کی داستان بھی طویل ہے پاکستان کے پہلے آئین کے بعد ۱۹۵۹ء کی تعلیمی پالیسی میں بھی اردو صرف رابطے کی زبان قرار دی گئی ابتدائی جماعتوں میں اردو کو تیسرے درجے سے شروع کرنے کے فیصلے نے اسے نئی مشکل میں ڈال دیا۔ حمود الرحمٰن رپورٹ میں موجود ذریعۂ تعلیم کے معاملے میں قومی زبان کے بجائے انگریزی کو جاری رکھنے کی تجویز پیش کی گئی۔ ۱۹۷۲ء کی تعلیمی پالیسی میں قومی زبان اور ذریعۂ تعلیم کا کوئی خاص ذکر نہیں، رعایتی پالیسیاں اردو زبان کے نفاذ نیز تعلیمی سطح پر اہمیت کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتی رہیں ۱۹۷۹ء کی تعلیمی پالیسی سے متعلق ڈاکٹر بشیر سیفی کی یہ رپورٹ قابلِ غور ہے جس میں انھوں نے انگریزی زبان معیارات کی زبان اور اردو لازمی زبان کا محض وسیلہ جیسے دو اہم امور پر بات کی ہے اور اعداد و شمار کے ذریعے یہ باور کرنے کی کوشش کی ہے کہ کن اقدامات نے پاکستانی معاشرے میں اردو زبان کے نفاذ اور اسے ذریعۂ تعلیم بنانے جیسے اہم امور پر منفی اثرات مرتسم کیے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''۱۹۷۹ء کی تعلیمی پالیسی کے مطابق اپریل ۱۹۷۹ء سے پہلی جماعت میں داخل ہونے والے طلبا کو اردو ہی میں تعلیم دی جاتی تھی اور ۹۰-۱۹۸۹ء میں میٹرک کے امتحانات اردو میں منعقد کرنے کا اعلان کیا گیا۔ نیز اپریل ۱۹۸۹ء کے بعد کسی انگریزی ذریعۂ تعلیم کے نئے ادارے کے قیام کی اجازت بھی نہیں تھی۔ ان اقدامات و اعلانات کے بعد یہ امید بندھ گئی تھی کہ ۹۰-۱۹۸۹ء تک دورِ غلامی کی اس لعنت سے چھٹکارا مل جائے گا کیونکہ نئی تعلیمی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے چیف کالج اور دوسرے مشنری اداروں نے اردو میڈیم کا آغاز کر دیا تھا (یہ الگ بات ہے کہ ان اسکولوں میں انگریزی بھی ابتدا ہی سے بطور لازمی مضمون پڑھائی جارہی تھی) مگر ۲۷/نومبر ۱۹۸۴ء کی ایک ترمیم کی رو سے ان تعلیمی اداروں کو انگریزی میڈیم برقرار رکھنے اور غیرملکی نصاب پڑھانے کی اجازت دے دی گئی جن کا غیرملکی

یونیورسٹیوں اور کالجوں سے الحاق ہے اور وہ اپنے طلبا کو غیر ملکی امتحانات کے لیے تیار کرتے ہیں، اس ترمیم سے تعلیمی اداروں میں نفاذ اردو کو شدید دھچکا لگا کیونکہ اس استثنائی اجازت کو اذنِ عام سمجھ کر تعلیم کو منافع بخش کاروبار سمجھنے والوں نے دھڑا دھڑ انگریزی میڈیم اسکول قائم کرنے شروع کر دیے جنھیں طبقۂ امرا کی سرپرستی حاصل ہے کیونکہ ان اداروں میں اعلیٰ طبقوں کے بچے ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔''[۱۲]

ڈاکٹر بشیر سیفی کے یہ اعداد و شمار اس امر کی بھی تصحیح کرتے ہیں کہ جب ۱۹۷۳ء کی حکومت کے وزیر تعلیم نے ایک رعایت یہ دی تھی کہ اس ملک کا طالبِ علم انگریزی تعلیم حاصل کر کے دیگر ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جا سکتا ہے اور وہاں روزگار تلاش کر سکتا ہے۔ اس رعایت کے خطرناک اثرات ہمارے معاشرے پر کس حد تک مرتسم ہوئے تاریخ اس کی گواہ ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور زیادہ روپیہ کمانے کی دھن میں پاکستان کا تعلیم یافتہ اور ہنرمند طبقہ دیگر ممالک میں روزگار حاصل کرنے اور پھر وہیں رہ بسنے کی کوشش میں مصروفِ عمل ہے جبکہ ہم ترقی پذیر ممالک کی صف میں شامل ہونے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ اب تک لاکھوں پاکستانی بیرونی سرمایہ کاری کی بھٹی کا ایندھن بن چکے ہیں جبکہ ملک میں رہ جانے والے احساسِ کمتری کا ایندھن۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک کی ۸۵ فیصد آبادی انگریزی نہیں جانتی باقی ۱۵ فیصد خواندہ آبادی میں سے صرف ایک فی صد ایسی ہے جو انگریزی جاننے کا دعوا کر سکتی ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود انگریزی کو قوم کے ذہن پر سوار کر کے ساری قوم کو مسائل میں الجھا کر اعصابی مرض میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تخلیقی و تحقیقی کام کرنے کی رفتار قدرے سست ہے اگر تخلیقی اور تحقیقی کام کر کے اسے ترجمے کے ذریعے بین الاقوامی علوم کے مدِمقابل لایا جائے تو یقیناً تعلیمی و علمی سطح پر بہتر نتائج سامنے لائے جا سکتے ہیں۔[۱۳]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو زبان کے نفاذ اور تعلیمی سطح پر اس کی ترویج و ترقی کے لیے دو اہم مسئلوں کی طرف نشاندہی کی ہے۔ ایک یہ کہ انگریزی کی جگہ اردو کو دی جائے تاکہ قوم کی فکری، ذہنی، تخلیقی صلاحیتیں پروان چڑھ سکیں جب تک یہ نہیں ہوگا ہم بہ حیثیت ایک قوم ایک زبان ترقی نہیں کر سکیں گے۔ اردو کے سلسلے میں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ اس میں ابھی انگریزی کی جگہ لینے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تو ان کا کہنا ہے کہ جب ہم کسی زبان کو استعمال ہی نہیں کریں گے اور اس میں اپنی صلاحیت شامل نہیں کریں گے تو اس میں صلاحیت کیسے پیدا ہوگی ان کی یہ مثال قابلِ توجہ ہے کہ ''آخر چلتی گاڑی میں پہیہ کیسے بدلا جا سکتا ہے؟[۱۴]

دوسرا مشورہ سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کے لیے ہے جو اردو کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ فوراً ایسے منصوبوں پر عمل کریں جن سے فوری دفتری و قومی ضروریات پوری کی جا سکیں مثلاً اردو ٹائپ رائٹرز تیار کرائے جائیں۔ ان کی تیاری میں ۳۳ سال کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ صرف چھ ماہ کا کام ہے۔ اردو کا جو ٹائپ رائٹر مروج ہے اسے ہی تیار کرا لیا جائے اور اس کے لیے کسی زرمبادلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے ان دونوں اہم مشوروں کی رو سے آج علمی و تحقیقی سطح پر ترجمے کے ذریعے نیز بین الاقوامی سطح پر بھی کام ہو رہا ہے اور اردو ان پیج اور کمپوزنگ کے ذریعے اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اہم ترین ادارے بھی قائم ہو گئے ہیں لیکن نفاذ اردو اور تعلیمی سطح پر اس کے لازمی ہونے کا مسئلہ جوں کا توں ہے۔

تمام تر حقائق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اردو زبان جو وقت کی ضرورت ہے اس کی ترویج کے لیے کن امور پر زیادہ کام کرنا ضروری ہے ایک اہم تجزیہ جو تقاضائے زمانہ ہے راشد اشرف بھی پیش کرتے ہیں۔

''انگریزی سے ترجمے کی اہمیت جتنی آج ہے پہلے محسوس نہیں کی گئی تھی۔ انگریزی اخباروں، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر انگریزی متن کو اردو کا جامہ پہنا کر پیش کیا جاتا ہے اس لیے یہ کہنا کچھ ایسا غلط نہیں ہوگا کہ عام اردو جاننے والے کا رشتہ بتدریج طبع زاد اردو تحریر سے کم سے کم تر ہوتا جائے گا۔ سرکاری زبان انگریزی ہے، سرکاری بیانات انگریزی میں جاری ہوتے ہیں۔ عدالتوں کی زبان انگریزی ہے فیصلے انگریزی میں ہوتے ہیں۔ بینک اور تجارت کی زبان انگریزی ہے علاج معالجے کی زبان انگریزی ہے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر انگریزی جس توانائی اور اثر کا اظہار کر رہی ہے اس کے پیش نظر ہمارے معاشرے کے تار و بود میں انگریزی سرایت کرتی جارہی ہے لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ عام لوگوں کی سطح تک پہنچنے کے لیے سہارے کی زبان اب بھی اردو ہے اور قرائن کہتے ہیں کہ ابھی بہت عرصے تک رہے گی۔ یہی ضرورت ترجمے کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔''(۱۵)

متذکرہ بالا تجزیہ ہمیں ''عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد'' کے قیام اور میر عثمان علی خان کے اس حکم کے مندرجات کی یاد دلاتا ہے جس میں انھوں نے اس ادارے کے تعلیمی منشور میں ''اردو زبان'' کو بحیثیت ذریعۂ تعلیم رائج کرنے کی منظوری دی تھی جب میر عثمان علی خان کے دربار میں ۲۹ر جمادی الثانی ۱۳۳۵، ۲۲ر اپریل ۱۹۱۷ء کو ایک عرض داشت پیش کی گئی جس کے زبان سے متعلق خاص نکات درج ذیل تھے۔

۱۔ انگریزی زبان کی تعلیم بہ حیثیت ایک زبان کے لازم ہو۔

۲۔ عربی، فارسی، سنسکرت، مرہٹی، تلنگی اور کنڑی زبانوں کی تعلیم اور ان کے متعلق علمی تحقیق کا انتظام ہو۔

۳۔ علومِ جدیدہ و سائنس کی تعلیم و تحقیق کا کافی انتظام ہو۔

۴۔ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ اردو قرار دیا جائے۔

۵۔ ایک شعبہ تالیف و تراجم قائم کیا جائے جو مغربی زبانوں سے اعلیٰ درجے کی تصانیف کا ترجمہ کرے۔

اس عرض داشت کے جواب میں جو حکم میر عثمان علی خان نے جاری کیا اس کی رو سے:

''مجھے بھی عرض داشت اور یادداشت کی مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمی، دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور جس

میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ہی ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجے کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔ اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دیا جائے مگر انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔ لہٰذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میرے تخت نشینی کی یادگار میں حسبِ مذکور محولہ عرض داشت کے موافق ممالک محروسہ کے لیے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام (عثمانیہ یونیورسٹی) حیدرآباد ہوگا۔ اور ہر اہم و اصولی امر کی نسبت جو اس کارروائی میں پیدا ہو صراحت کر کے میری منظوری وقتاً فوقتاً حاصل کی جاتی رہے۔''[۱۶]

جامعہ عثمانیہ میں دارالترجمہ قائم کیا گیا اور عملی طور پر اس کے حکم کے نافذ العمل ہونے کی کوشش شروع کر دی گئیں۔ اس دارالترجمہ سے اس وقت کی اہم اور مقتدر شخصیات منسلک ہوئیں جنھوں نے مغربی و مشرقی علوم وفنون سے متعلق تصانیف کو ترجمے کے ذریعے اردو زبان میں منتقل کرنے کا کام سرعت کے ساتھ کیا۔ اس جامعہ میں ۳۰ سال تک اردو زبان ذریعۂ تعلیم رہی ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہندوستان میں پولیس ایکشن کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ذریعۂ تعلیم کا باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

حواشی

۱۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، آئین پاکستان تعارف و تجزیہ ۱۹۷۳ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۱

۲۔ ندیم شفیق ملک (مترجم)، اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء ایک مطالعہ، فیروز سنز کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۲۱۔۱۲۰

۳۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، آئین پاکستان تعارف و تجزیہ ۱۹۷۳ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۲

۴۔ ایضاً، ص ۲۰

۵۔ شیخ عطا اللہ (مترجم)، دستورِ پاکستان، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۵۶ء، ص ۱۳۶

۶۔ ایضاً، ص ۵

۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادب، کلچر اور مسائل، رائل بک کمپنی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۷۶

۸۔ پروفیسر محمد خلیل اللہ، دساتیر عالم، شعبۂ تصنیف و تالیف اردو کالج، کراچی، جنوری ۱۹۶۱ء، ص ۲

۹۔ محمد علی چراغ، تاریخِ پاکستان، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۵۳۷

۱۰۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، آئین پاکستان تعارف و تجزیہ ۱۹۷۳ء، جنگ پبلی کیشن، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۶۳

۱۱۔ جسٹس ارشاد حسن خان (مترجم) پاکستان کا دستور (ترمیم شدہ لغائت ۱۹۸۷ء)، کلاسک، لاہور، اگست ۱۹۹۲ء، ص ۱۴

۱۲۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، ذریعہ تعلیم کی بحث، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء، ص۱۰

۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادب، کلچر اور مسائل، رائل بک کمپنی، ۱۹۸۶ء، ص۳۷۷

۱۴۔ ایضاً، ص۳۷۹

۱۵۔ راشد اشرف، جدید صحافتی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص V

۱۶۔ مجلّہ عثمانیہ، شمارہ نمبر۱۰، ۱۹۸۷ء، حیدرآباد دکن